خالد امین *

# آرمینیس ویمبری: انیسویں صدی کا ایک اہم مستشرق

استعماری قوتوں کو ان کے نوآبادیات میں فروغ دینے کے لیے علمی بنیادیں استوار کرنے میں مستشرقین کے کردار کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے یورپ کے اہم مستشرقین میں اسلامی ممالک خصوصاً وسط ایشیا کی تاریخی و تہذیبی صورت حال کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آرمینیس ویمبری (Arminius Vambery) (۱۸۳۲ء–۱۹۱۳ء) کا مطالعہ ناگزیر ہے، کیونکہ ویمبری نے وسط ایشیا میں روسی اقتدار کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ ان کے جبر وتشدد کے عینی شاہد بھی رہے ہیں۔ انھوں نے روس کے اقدامات کی نہ صرف مذمت کی بلکہ برطانوی نوآبادیات کو روس سے بہتر جانا۔ انھوں نے اپنی تصنیف تاریخ بخارا میں اس بات کا ذکر واضح لفظوں میں کیا ہے۔ وہ یورپ میں دریاے ڈینیوب (Danube) کے جزیرے شت کے ایک گاؤں میں ۲۹ مارچ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔[۱] ابتدا ہی سے ویمبری کو زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ ہنگیرین (Hungarian)، لاطینی، فرانسیسی اور جرمن میں مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ روسی زبان بھی سیکھی۔ بیس سال کی عمر میں ترکی زبانوں میں خاصی دست گاہ حاصل کر لی۔ ترکی میں حسین دایم پاشا کے بچوں کے اتالیق مقرر ہوئے اور پھر اپنے محسن دوست ملا احمد آفندی کی مدد سے ترکی میں سرکاری ملازمت اختیار کی[۲] اور ترقی کرتے

کرتے فواد پاشا کے سیکریٹری کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ یہ یاد رہے کہ فواد پاشا ۱۸۵۳ء میں ترکی کے وزیر خارجہ تھے۔

ترکی میں ویمبری نے دیگر تالیفات کے علاوہ جرمن و ترکی زبان کا لغت تیار کیا اور یہاں رہتے ہوئے انھوں نے مشرقی زبانیں بھی سیکھیں، پھر ترکی ہی سے انھوں نے مشرقِ وسطیٰ کا سفر کیا اور وہاں کے چشم دید واقعات، سیاسی و معاشرتی زندگی کا نقشہ اپنے سفر نامے میں پیش کیا۔ ایک بھرپور زندگی گذارنے کے بعد جب وطن لوٹے تو وہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا اور پھر انھوں نے ہنگری میں بداپسٹ یونی ورسٹی (Budapest University) کے مشرقی السنہ شعبے میں معلّمی کے فرائض انجام دیے۔[۳]

یورپ کے مختلف رسائل و جرائد میں مشرقی مسائل پر ویمبری کے مضامین اب بھی اہم حوالوں کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں ویمبری کے ان کاموں کا جائزہ لیا جائے گا جو برعظیم اور وسط ایشیا کے سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی حوالوں سے نہایت اہم ہیں۔ ان کا زیادہ تر کام مسلمانوں کے تہذیبی، تمدنی، لسانی، معاشرتی اور تاریخی جائزوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کی تاریخی اور سیاسی زندگی کا بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور اس میں خاصی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ ایک مستشرق ہونے کے ناتے ان کے خیالات بعض مقامات پر متعصّبانہ ہیں مگر انھیں اس تعصب کی بنیاد پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہاں پر ویمبری کی چند کتابوں کے نام پیش کر دیے جائیں تاکہ ان کے تہذیبی اور ثقافتی مطالعات کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکے:

۱۔ *History of Bukhara*، (۱۸۷۳ء)۔

۲۔ *Arminius Vambery, His life and Adventures*، (۱۹۰۴ء)۔

۳۔ *The Story of Hungary*، (لندن ۱۸۸۷ء)۔

۴۔ *The Coming Struggle for India*، (لندن ۱۸۸۵ء)۔

۵۔ *The Travels and Adventures of the Turkish Admiral Sidi Ali*

*Reis in India, Afghanistan, Central Asia, and Persia, during the years 1553–1556; Translated from the Turkish, with Notes*، (۱۸۹۹ء)۔

۶۔ *Western Culture in Eastern Lands*، (۱۹۰۶ء)۔

ویمبری کی لکھی گئی ان کتابوں میں کچھ کتابوں کا اردو میں بھی ترجمہ کیا گیا جن میں ایک کتاب مغربی تمدن مشرقی ممالک میں (*Western Culture in Eastern Lands*) کے ایک حصے کا ترجمہ ظفر عمر نیلی چھتری والے (وفات ۴دسمبر ۱۹۴۹ء) نے کیا ہے۔ اس کتاب کے ترجمہ کیے جانے کا اہم مقصد یہ تھا کہ اس میں ویمبری نے ترکی، ایران، برعظیم کے سیاسی حالات کو مدنظر رکھ کر جو پیشین گوئیاں کی تھیں، انھیں پیش کیا جائے۔ ان میں بعض پیشین گوئیاں وقت گذرنے کے بعد درست معلوم ہوتی ہیں۔ ویمبری نے کتاب کے اس حصے میں یورپی نوآبادیات اور مسلم ممالک پر یورپی یلغار کو موضوع بناتے ہوئے اپنے خیالات میں اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ یورپ یا مغربی ممالک اگر ان کارروائیوں سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ اس سے مسلمان اور اسلام کمزور ہو جائے گا تو وہ ان کی خام خیالی ہے کیونکہ آگے آنے والے حالات، ان میں سیاسی بیداری کو جلا بخشیں گے اور مسلم ممالک میں جاری احیا کی تحریکوں سے مسلمان دوبارہ نئی زندگی سے روشناس ہو جائیں گے۔

ویمبری نے اس بات کی دلیل یہ فراہم کی ہے کہ مشرقی ممالک میں علم کی ترویج ہمیشہ طبقۂ اعلیٰ میں ہوا کرتی تھی، ادنیٰ طبقہ یا کم حیثیت بعد میں علم حاصل کرتے تھے۔ جب کہ مغربی تہذیب و تمدن کے آنے سے مسلمان ممالک میں اعلیٰ و ادنیٰ طبقے دونوں حصولِ علم کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے اسلامی معاشرہ اس رویے کے عام ہونے کی وجہ سے ترقی کر جائے گا۔ انھوں نے اس کی مثال ترکی میں جدید خیالات کی ترویج کرنے والوں سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ترکوں نے گذشتہ چند سالوں میں تعلیمی میدان میں نہایت حیرت انگیز اقدامات کیے ہیں۔ پچاس سال قبل دینی مدارس کو جن میں جدید علوم کی تعلیم ہوتی تھی پرانے قسم کے مکاتب قرآنی سے سخت مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ موخرالذکر مدارس میں مذہبی تعلیم کے علاوہ کسی اور چیز کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ ۱۸۹۶ء کے اعداد و شمار سے من جملہ ایک کروڑ اسّی لاکھ مسلمان، ترکی کے تقریباً دو لاکھ پچاس ہزار طلبہ، مدارس اعلیٰ و

درمیانی میں جہاں جدید علوم کی تعلیم ہوتی ہے، پائے جاتے ہیں۔[4]

انھوں نے مزید لکھا کہ اب ترکوں کی ایک کثیر تعداد یورپی زبانوں میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ نیچرل سائنس، تاریخ و جغرافیہ میں اب مہارت رکھتے ہیں اور عورتیں بھی اب جدید علوم کے حصول کے لیے کوشاں نظر آتی ہیں۔ ان کے علم حاصل کرنے کی وجہ سے اب ترکی میں جدید اصلاحات کو ترویج دینے میں آسانی رہے گی۔[5]

ویمبری کا نقطۂ نظر کئی حوالوں سے دلچسپ ہے۔ صرف ویمبری ہی نہیں بلکہ کئی اور اہم مستشرقین نے اسلامی ممالک پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ مسلمان چونکہ جدید علوم سے بہرہ مند نہیں ہیں اس لیے ترقی سے کوسوں دور ہیں۔ ویمبری نے اس سے بھی بڑھ کر ایک الزام یہ عائد کیا کہ مسلمانوں میں صرف طبقۂ اعلیٰ علم حاصل کرتا تھا اور ادنیٰ طبقہ اس سے محروم تھا۔ یہ تمام الزامات نہایت مبالغہ آمیز ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء–۱۹۱۴ء) نے یورپ کے مستشرقین کے انھی سوالات کے جوابات اپنے دو اہم مقالوں ''ترجمہ'' اور ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میں دیے ہیں۔ شبلی نے اپنے مضمون ''ترجمہ'' میں صرف ان علما کے حالات نقل کیے ہیں جو دیگر زبانوں سے کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ یہ کتابیں تاریخ، فلسفہ، طب، جغرافیہ کے موضوعات پر مبنی تھیں بلکہ شبلی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ان تمام علوم میں اہل یورپ کے پیشوا تقریباً مسلمان رہے ہیں۔[6] شبلی نے ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میں ترکی کے مدرسوں کی مزید کیفیات کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> محمد ثانی تمام بادشاہوں سے بڑھ کر نکلا اس کے زمانے میں تعلیم کا بڑا عام چرچا تھا اور لوگ بڑے بڑے عہدے پانے لگے۔ قسطنطنیہ کا فاتح بخوبی جانتا تھا کہ سلطنت کے قیام اور وسعت کے لیے علاوہ جواں مردی اور قواعد دانی کے کچھ اور بھی ضروری ہے چونکہ وہ خود پڑھا لکھا تھا اس لیے اس نے اپنی رعایا کی تعلیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ محمد ثانی نے علاوہ ابتدائی مدرسوں کے جو مکتب کے نام سے مشہور ہیں اور ہر گاؤں میں بکثرت پائے جاتے ہیں، بڑے بڑے مدرسوں کی بنیاد ڈالی ...... یہ تعلیم بے شبہہ اسی تعلیم کے مطابق ہے جو پندرھویں صدی میں پیرس اور کیمبرج میں دی جاتی تھی۔[7]

اسی مضمون میں شبلی نے مسلمانوں کے قدیم طرز تعلیم کی بھی کئی مثالیں پیش کی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں حصول علم کے لیے اعلیٰ و ادنیٰ کی تخصیص نہیں تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر اسپرنگر کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ڈاکٹر اسپرنگر صاحب تخمینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے اب اگر قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو ایک عام تعلیم کا معقول اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[۸]

ویمبری وسط ایشیا اور ترکی کے سیاسی حالات سے اہل یورپ کی بدگمانی کو دور کرنا چاہتے ہیں مگر خود اپنی تصنیفات میں کئی مواقع پر مختلف قسم کے تعصّبات اور بدگمانیوں کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ اہل یورپ کی معلومات کو درست کرنے کا جو انداز اپنا رہے ہیں وہ دیانت دارانہ نہیں ہے ان کا خیال ہے کہ اب مسلمان چونکہ مغربی علوم حاصل کر رہے ہیں اس لیے انھیں تاریک دور کا کہنا درست نہیں ہے۔ اہل یورپ کے بیشتر مستشرقین کے الزامات مسلم ممالک سے عدم واقفیت کی بنا پر ہیں۔ اسی لیے ان کا کہنا ہے:

> حال میں ایک اخبار موسومہ تـرک جاری ہوا ہے، جس میں قومی بیداری کی ضرورت بانیان سلطنت عثمانیہ کی عظمت اور پیغمبر تک کی قوم پر اپنی فضیلت نہایت شد ومد سے ظاہر کی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں عربی اخبار الـمـنـار جو قاہرہ سے شائع ہوتا ہے عربوں کی حمایت کرتا ہے اور دونوں میں مباحثے کی گرم بازاری رہتی ہے۔ پہلے اس قسم کا مباحثہ کفر کی حد تک پہنچتا تھا لیکن آج وہ مادی ترقی کو ہیجان میں لانے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہی عمل اہل اسلام کی ترقی کا باعث ہے۔[۹]

اس تبصرے کے بعد ویمبری کا استدلال یہ ہے کہ اہل یورپ چونکہ مسلمانوں میں موجود اس رجحان سے ناواقف ہیں اس لیے اسلام کو مسلمانوں کی ترقی میں مانع قرار دے رہے ہیں۔[۱۰] انھوں نے مسلمانوں کی فن تعمیر اور دیگر اہم ترقی کی مثالوں کو پیش کر کے یورپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی معاشرہ اور اسلام جمود کا شکار نہیں ہے بلکہ مغربی تمدن اور مادی ترقی کی خواہشات نے

اسے ارتقا اور آگے بڑھنے کے لیے کوشاں کر دیا ہے۔

اس تجزیے کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ عہد میں اسلامی ممالک میں موجود سیاسی صورتحال کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ جس مادی ترقی کے حصول کے لیے اہل اسلام دو سو سال سے تگ و دو کر رہے ہیں کیا اس کے نتائج اہل یورپ کے منشا کے مطابق ہیں۔ بنظرِ عمیق آج بھی مسلمان معاشرے کی صورتحال اہل یورپ کے حسب منشا قرار نہیں دی جا سکتی۔ بہ ظاہر جدید علوم کی ترقی و ترویج مسلمانوں کے یہاں پہلے کی نسبت کہیں بہتر انداز میں ہے مگر ان علوم کو حاصل کرنے والے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد مغربی تمدن سے بھی نالاں دکھائی دیتی ہے اور اس کا ادراک مغربی قوتیں بخوبی رکھتی ہیں۔

ویمبری نے اپنی اس تصنیف میں ترک حکمران سلطان عبدالحمید (۱۸۴۲ء – ۱۹۱۸ء) کے ان اقدامات کی تعریف کی ہے جو انھوں نے جدید تعلیم کے حوالے سے کیے تھے مگر ساتھ ہی ان اقدامات کی مذمت بھی موجود ہے جو عالم اسلام کو ایک متحدہ سیاسی محاذ پر تشکیل دینے کے حوالے سے تھی۔ انھوں نے اس میں ان ممالک اسلامیہ کی ترقی کے امکانات پر کافی بحث کی جو مغربی نظام کو اپنے یہاں رائج کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ایسی مثالیں ان کی کتاب میں کثرت سے موجود ہیں جہاں دانشور طبقہ مغربی علوم سے بہرہ مند ہے یا اس کی اشاعت کے لیے جدوجہد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔



ویمبری کی مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی صرف اس بنیاد پر ہے کہ وہ جدید علوم حاصل کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگر وہ اپنی بنیاد پر قائم رہنا چاہتے تو موصوف اپنے نقطۂ نظر کو ایک خاص جذبے کے تحت جسے متعصّبانہ بھی کہا جا سکتا ہے فوراً تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس کی کئی مثالیں ان کی ان تصانیف میں دیکھی جا سکتی ہیں جہاں لوگ اسلامی اقدار کو اپنانے پر مصر نظر آتے ہیں۔ ویمبری نے نو آبادیات کے توسیعی عمل کو نہ صرف سراہا بلکہ برطانوی طرز حکومت کو روس کے مقابلے میں بہتر گردانا ہے۔ انھوں نے روس اور برطانوی عملداری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ایشیا میں روس کے مقابلے میں برطانوی حکمت عملی مغربی تہذیب و تمدن کے پھیلاؤ میں زیادہ معاون رہی ہے، کیونکہ سیاسی امور میں برطانوی قوم کا مزاج ایشیائی قوموں سے زیادہ قریب ہے۔[11]

انیسویں صدی میں ایشیا، آدھا برطانیہ اور آدھا روس کے قبضے میں تھا اور دونوں قومیں مسلمانوں کی تہذیب کے مقابلے میں اپنے اثرات ان ممالک پر مرتب کر رہی تھیں۔ اگر ان دونوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بجا ہے کہ روس کے مقابلے میں برطانوی اثر و رسوخ ایشیا میں تہذیبی اور تمدنی حوالے سے زیادہ رہا ہے اور اب بھی موجود ہے۔ ویمبری نے اس کتاب کے ایک حصے میں انھی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> مغربی یورپ کی ماتحتی میں مسلمان زیادہ فارغ البال رہیں گے کیونکہ وہ وہاں آزادی اور تہذیب و تمدن کا سبق سیکھ رہے ہیں اس کے باوجود اہل یورپ کو اس کاادراک ہونا چاہیے کہ ان کے اتالیقوں کی خواہشات ان سے مختلف ہیں آخر کار یہ تمام مسلم ممالک سیاسی آزادی حاصل کر لیں گے۔ مصر، ترکی، ہندوستان میں اسلامی معاشرے کے سرکردہ لوگ جدید طریقے کو اپناتے ہوئے نئے سیاسی اندازفکر سے آزادی کی جدوجہد کی بنیادیں رکھ رہے ہیں اور قومی آزادی کے خیالات ان میں اس درجے سرایت کر گئے ہیں کہ یورپ کا ان کو بیخ و بن سے مٹا دینا قطعی ناممکن ہے۔[۱۲]

ویمبری کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ ان کے یورپی حکمران شاید اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ ان کی حکومت اسلامی ممالک میں قائم رہے گی لیکن جلد یا بدیر ایسا وقت ضرور آئے گا جب کہ ہماری تمدنی خواہشات کے برعکس نتائج پیدا ہوں گے۔[۱۳] یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جس کی وجہ سے اہل مغرب مسلمانوں پر بھروسا نہیں کرتے اور مسلسل حربی، معاشی، تہذیبی و تمدنی سطح پر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔

روس اور برطانیہ کے مابین وسط ایشیائی ریاستوں کے معاملے پر جاری رہنے والی کش مکش کا جائزہ لینے کے لیے ویمبری کی اہم کتاب تاریخ بخارا (*History of Bukhara*) کا جائزہ لیا جانا کئی حوالوں سے ضروری ہے۔ تاریخ بخارا ایک ایسی تصنیف ہے جس میں انھوں نے اس خطے کی مبسوط تاریخ لکھی ہے اور کئی گمنام گوشوں کو دریافت بھی کیا ہے مگر اس میں بھی انھوں نے اپنے متعصّبانہ خیالات بھرپور طریقے سے پیش کیے ہیں۔

وسط ایشیا کا یہ مردم خیز خطہ اصل میں ہندوستانی تاریخ سے راست تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس سرزمین سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں نے یہاں حکومت کی ہے۔ ترکوں کی یہ سرزمین دنیا میں علمی،

ادبی اور جنگی مہمات کے حوالوں سے اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے، ان کا اتفاق اور نفاق بھی دنیا میں مشہور رہا ہے۔ جب کبھی اس علاقے میں زبردست حاکم فرماں روائی کرتا رہا یہاں یکجہتی کی صورت نظر آئی، مگر مرکز کے کمزور ہوتے ہی ہر جگہ سرکشی اور بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگتے تھے۔کوئی خاندان بھی زیادہ دیر تک اپنے آپ کو برسراقتدار نہ رکھ سکا۔[۱۴] مشترکہ خطرے کے وقت بھی انھیں اتفاق اور اتحاد کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ غیر ملکی طاقت خصوصاً روس کے قبضے میں آ گیا اور آزادی کی ایک ہزار سالہ تاریخ اور روایت روس کی جبری حکومت کے آگے تباہ و برباد ہوگئی۔[۱۵]

آرمینیس ویمبری نے یہ کتاب ۱۸۷۳ء میں لکھی اور ۱۹۵۹ء میں نفیس الدین احمد نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔مصنف نے بڑی کاوش اور تحقیقات کے بعد یہ کتاب لکھی ہے وہ خود سال ہا سال اس خطے کی سیاحت کرتے رہے ہیں اور وسط ایشیا کے خوانین کے ساتھ ان کے اچھے مراسم بھی رہے ہیں۔ ترکمان قبائل کے ساتھ کئی دن گذارنے اور ان کی زبان، روایات اور عادات کے عینی شاہد ہونے کی وجہ سے اس کتاب میں مصنف کا تجزیہ نہایت معروضی ہے۔مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کی ایک وضاحتی کتابیات بھی مرتب کی ہے جس کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے علمی اور عملی تحقیق کی ہے جو لائق ستائش بھی ہے۔ اس کتاب کی تالیف کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> بخارا کی تاریخ کے دو حصے ہیں۔پرانی تاریخ یا ماوراء النہر کی تاریخ اور موجودہ ریاست بخارا کی تاریخ۔ پہلا حصہ امیر تیمور کے زوال کے وقت تک ہے یہ ملک اگرچہ کسی تاریخی کتاب کا موضوع نہیں تھا مگر وسط ایشیا کے حالات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی دنیا کے اندرونی حالات سے اور کبھی مغربی اسلامی دنیا سے یہاں کے حالات ملے جلے ہوئے تھے۔[۱۶]

ان تمام خوبیوں کے باوجود اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مصنف اسلامی اقدار و روایات سے بہت حد تک ناواقف ہیں۔ مذہبی تعصب رکھنے کی وجہ سے ان کی یہ تصنیف معلوماتی ہونے کے باوجود بھی حقائق کا دیانتدارانہ تجزیہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ رجحان ہمیشہ سے مستشرقین کے یہاں رہا ہے کیونکہ جب یہ لوگ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ مختلف ملکوں کے مقامی رسم و رواج کو اہمیت

دیتے ہوئے انھیں عین اسلام سمجھ لیتے ہیں۔ اگر کسی ملک میں عزلت نشینی کا زیادہ رواج ہے تو وہ اسے اسلام خیال کریں گے، اگر کسی دوسرے ملک میں علما اور صوفیہ کا لباس اور ہے تو اسے بھی اسلام کی نئی جہت قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں مشرقی، مغربی اور ایشیائی اسلام وغیرہ کی تخصیصی صورت دکھائی دیتی ہے۔[۱۷] ویمبری بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔

ویمبری نے بخارا کی تاریخ میں ہندوستانی فرماں رواؤں کے اس خطے سے تعلق کو خصوصی انداز میں دیکھا ہے۔ خاص کر اس کتاب کا وہ حصہ جس میں ظہیر الدین بابر(۱۴۸۳ء – ۱۵۳۰ء) اور بخارا کے تاریخی رشتوں کو بیان کیا ہے، ہمارے لیے نہایت اہم ہے۔ اس تاریخی رشتے کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بابر کی بخارا کی سرزمین سے وابستہ زندگی کے اثرات ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب پر گہرے ہیں۔ بابر کے سمرقند پر حملے کے نتائج ہندوستان پر اپنے اثرات کے حوالے سے کئی اہم تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ویمبری نے اس کتاب میں ان سیاسی عوامل کا جائزہ نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

ویمبری نے لکھا ہے کہ بخارا کے خوانین صرف جنگی مہمات کو سر کرنے کے لیے اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھتے تھے بلکہ ان میں علوم وفنون سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کا مزید کہنا ہے کہ ایشیا یا دوسری جگہ کا مسلمان تمدن، تہذیب اور معیارِ اخلاق وغیرہ کا جو تصور رکھتا ہے، وہ ان حالات کی پیداوار ہے جو ہرات اور سمرقند کے درباروں میں تھے اور جن فنون کی طرف بہت توجہ دی گئی وہ خطاطی اور مصوری تھے۔ خطاطی کا فن سلطان علی کا شغل تھا۔ مصوری میں بہزاد اور شاہ مظفر نے بہت شہرت حاصل کی۔ اگرچہ تیموری پکے سنی تھے مگر اپنی کتابوں کو رنگین تصاویر اور نقوش سے مزین کرتے تھے اور عمارات پر تصاویر بناتے تھے۔ بابر کے ایک بیان کے مطابق اس نے ابوسعید تیموری کے محل میں مجسمے اور دیواروں پر جنگی تصاویر بنی دیکھیں۔[۱۸]

سمرقند و بخارا کے درباروں میں صرف یہ نقوش نہیں تھے بلکہ شہزادوں اور سپاہیوں اور بزرگوں کی تصاویر بھی ہوتی تھیں۔ شاہ رخ، الغ بیگ، ابوسعید اور مرزا حسین کے زمانے میں بہت عمدہ عمارات تعمیر ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ استاد محمد سبز اور استاد قوام الدین دونوں نے رفاہ عام کی ہزار ہا

عمارات بنوائیں۔[۱۹]

ویمبری نے اس مقام پر اپنی کتاب کے حاشیے میں لکھا ہے کہ جنوبی ایشیا میں تیموری خاندان کے بادشاہ شاہ جہاں (۱۵۹۲ء – ۱۶۶۶ء) کے زمانے میں استاد احمد اور استاد حامد نے آگرہ اور دہلی میں عمارات بنوائیں، جن میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی وغیرہ شامل ہیں۔[۲۰]

یہ تصنیف صرف تاریخی واقعات پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں تاریخی تجزیہ بھی کئی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ مثلاً ازبک اور شیبانی محمد خاں کے درمیان جو معرکہ ہوا اس کی تفصیل اپنی جگہ مگر تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ ان بادشاہوں کی علمی و ادبی مصروفیات کا بھی ذکر موجود ہے۔ بخارا اور سمرقند کے خوانین سلطنت عثمانیہ کے ساتھ کیا روابط رکھنے کے خواہاں تھے اس کا ذکر خصوصی حوالوں سے ملتا ہے۔



اس کتاب کے آخری باب میں انھوں نے بخارا کے امیر، امیر نصراللہ (دور حکومت، ۱۸۲۶ء–۱۸۶۰ء) کے حالات بیان کیے ہیں۔ یہ عہد وسط ایشیا میں روسیوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا تھا۔ روس اور وسط ایشیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان دونوں خطوں کے سیاسی اور تجارتی تعلقات کئی صدیوں کو محیط ہیں۔ پرانی تجارتی شاہراہ جو والگا (Valga) کے ساتھ ساتھ ماسکو (Moscow) اور نواگراڈ (Novgorod) تک جاتی تھی اس کی وجہ سے روس کے بڑے تجارتی کاموں کو چلانے والے اصحاب اور بخارا کے خوانین خط کتابت کرتے رہتے تھے۔ یوں یہ عمل سیاسی معاملات میں بھی اضافے کا باعث بنا۔ ویمبری کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ پہلا سفارت خانہ ایم نیگری نے بخارا میں ۱۸۲۰ء میں قائم کیا۔[۲۱]

اس کتاب میں برطانیہ اور روس کے مابین وسط ایشیا کی ریاستوں کے حوالے سے موجود چپقلش کا بھی محاکمہ کیا گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ برطانیہ نے کبھی بھی وسط ایشیائی ریاستوں پر چڑھائی کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کو مہذب بنانے کے لیے سفارتی تعلقات استوار کیے تھے۔ نصراللہ کی موت کے بعد امیر مظفر الدین اور رومناف خاندان وسط ایشیا میں روسی تسلط کے خلاف تھوڑی سی مزاحمت کرنے کے بعد ناکام ہوگیا۔ یہاں کے باشندے اپنی سخت جانی کی وجہ سے کم وسائل کے

ہوتے ہوئے بھی کافی مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر ان کا مقابلہ کئی گنا بڑے دشمن سے تھا۔

روسی جرنل پیرافسکی نے جب قوقند کے باشندوں کو ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا تو انھوں نے اس کے جواب میں کہا کہ جب تک ہمارے پاس بارود کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ اس وقت تک مقابلہ کریں گے۔[۲۲] بہرحال قوقند پر بھی روس فاتح رہا اور اس نے ۸ اگست ۱۸۵۳ء کو اس علاقے کو فتح کیا۔[۲۳] اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل چیز اس کتاب میں یہ ہے کہ روس کے قبضے میں آجانے کے بعد بخارا کے مسلمانوں کے اقدار کو بھی کافی تبدیلی کا سامنا کرنا پڑا، یہ تبدیلی کس نوع کی تھی اس کو سمجھنے کے لیے ویمبری نے جو بات کہی اس کو پڑھنا ضروری ہے۔اس کے بقول:

> جس وقت سمرقند پر روسی جھنڈا لہرا رہا تھااس وقت یہ پرانا اور دور افتادہ ملک نئی دنیا اور نئے خیالات کے راستے پر قدم زن ہوا۔ ایسے شہر اور ملک میں جو مغرب کے باسیوں کو معلوم نہ تھا اب سامنے آگئے وہ مقامات جہاں یورپین سیاح بھیس بدل کر اور جان کا خطرہ مول لے کر ہی جا سکتے تھے اب نہ صرف محفوظ اور آزاد ہیں بلکہ عیسائیوں کے زیرِحکومت ہیں۔ تاشقند میں گرجا اور کلب بن گئے ہیں۔ اسی طرح خجند اور سمرقند میں۔ تاشقند میں ایک اخبار بھی ہے اور مؤذن کی اداس آواز میں یونانی گرجے کے گھنٹے لطف پیدا کرتے ہیں۔[۲۴]

ویمبری کے خیال میں وسط ایشیا میں روسی کامیابی اسلام پر ایک کاری ضرب ہے،[۲۵] کیونکہ بخارا اسلام کا اہم روحانی مرکز بن کر ابھرا تھا۔ یہاں کے عزلت گزیں، درویش اور دینیات کے عالموں نے سلطنت عثمانیہ، مصر اور مراکش کی ذہنی تربیت میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔اسلامی دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں اس بات کا بہت رنج ہوگا کہ یہ مقدس سرزمین کفار کی موجودگی سے اپنے اثرات اور اقدار کو اسلامی ممالک میں منتقل کرنے میں ناکام ہو جائے گی، اور اسلام کے اس ستون کے گرنے سے جو گرد اڑے گی وہ سیاہ بادل کی طرح اسلام کے علمی مستقبل پر کئی عرصے تک چھائی رہے گی۔[۲۶]

ویمبری کی اس تاریخ نے صرف اس خطے کی تہذیبی اور سیاسی اقدار کا جائزہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس کی بدولت کئی اور اہم تاریخی مواد بھی منظر عام پر آئے جو ہندوستان اور وسط ایشیا کے تاریخی

روابط کی گہری بنیادوں کو بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ترک امیر البحر سیدی علی رئیس (۱۴۹۸ء– ۱۵۶۳ء) کا سفرنامہ مـرآۃ الـممالك بھی ہے، جس کا اردو میں ترجمہ محمد انشاء اللہ خاں (۱۸۷۰ء– ۱۹۲۸ء) نے کیا ہے۔

اس سفر نامے کے بارے میں ویمبری کا کہنا ہے کہ سید علی رئیس کے اس سفر نامے سے سولھویں صدی کے ایشیائی مسلمانوں کی شبیہ کا خاکہ بآسانی کھینچا جا سکتا ہے کیونکہ اس نے ہندوستان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کے حالات خود دیکھ کر بیان کیے ہیں اور وہ خود بھی کئی علوم میں مہارت رکھتا تھا اس لیے اس کی تجزیے کی صلاحیت ایک عام آدمی سے کئی گنا زیادہ تھی۔[۲۷]

اس سفر نامے میں ایک باب ''ہندوستان میں میرے تجربات'' کے عنوان سے موجود ہے جو نہایت دلچسپ ہونے کے علاوہ اس وقت کے سیاسی حالات کا اچھا تجزیہ بھی ہے، کیونکہ سیدی علی رئیس ہندوستان میں اس وقت آیا جب ہمایوں (۱۵۰۸ء – ۱۵۵۶ء) نے ہندوستان پر دوبارہ اقتدار قائم کیا تھا۔ اور چونکہ ترکی عالم اسلام میں اس وقت ایک بہت بڑا مرکز تھا اس لیے اس کے کسی بڑے فوجی افسر کی آمد کسی بھی بادشاہ کے لیے کئی حوالوں سے کارآمد تھی، اسی لیے ہمایوں نے اس امیر البحر کا پرتپاک استقبال کیا اور اسے نہایت عزت و احترام سے نوازا گیا۔ ہمایوں کے انتقال کے وقت سیدی علی رئیس اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے پورے واقعے کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

> جب میں ان کے تفرج گاہ سے رخصت ہونے کو تھا تو مؤذن نے اذان دی۔ بادشاہ کی عادت تھی کہ جب یہ آواز ان کے کانوں میں پڑتی تھی تو تعظیماً زانو جھکا لیا کرتے تھے۔ جب یہ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اسی وقت مؤذن نے اذان دی۔ حسب عادت انھوں نے زانو کو جھکا لیا مگر پاؤں پھسل گیا اور چند سیڑھیاں نیچے گرے جس سے ان کے سر اور بازو پر چوٹیں آئیں اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۲۸]

اس سفرنامے سے ہندوستانی بادشاہوں اور عثمانی خلافت کے مابین سفارتی تعلقات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ہمایوں اس امیر البحر سے کافی متاثر تھا۔ اس میں نظم و نثر کا ذوق بھی پایا جاتا تھا اس لیے ہمایوں نے اسے علی شیر ثانی کا خطاب دیا جو ترکی زبان کا مشہور شاعر تھا۔[۲۹] اس سفرنامے میں جابجا ہندوستان میں وزرا کے ساتھ اس کی ملاقات اور سیدی علی رئیس اپنی شاعری ان کے دربار میں

پیش کیے جانے کا تذکرہ کرتا ہے۔

ویمبری کی ایک اور اہم کتاب جس کا اردو ترجمہ منشی محبوب عالم (۱۸۷۵ء–۱۹۵۶ء) نے کیا ہے وہ ان کی سرگذشت ہے۔ اس تصنیف میں ویمبری نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خیوا، بخارا، افغانستان، سمرقند، ایران، کردستان کے سفر کے حالات بھی بیان کیے ہیں، جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف نے اپنی علمی اور تہذیبی تشنگی کو سیراب کرنے کے لیے تکلیف دہ حالات کا بھی بھرپور طریقے سے سامنا کیا۔ تنگ دستی کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی اور راستے میں پیش آنے والے تمام تر واقعات کو نوٹ کرتے رہے۔ اسی لیے یہ سفرنامہ صرف ایک ادبی تحریر نہیں بلکہ نوآبادیاتی دور میں روس اور برطانیہ کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔

ویمبری نے اس خطے میں طویل عرصہ رہ کر اس کے سیاسی، ادارتی، تہذیبی، تجارتی اور دفاعی احوال کا عمیق جائزہ لیا اور پھر اسے اپنی کتاب میں پیش کر کے نوآبادیاتی طاقتوں کے منصوبے کو آگے بڑھانے میں معاونت کی، کیونکہ کئی جگہوں پر وہ مسلمانوں کے بھیس میں سفر کر رہے تھے اور اپنے آپ کو سلطنت عثمانیہ کے خادم کے طور پر پیش کرتے تھے۔

وہ لکھتے ہیں کہ جب میں ہرات پہنچا تو ہرات کے بادشاہ کے دربار میں گیا، چونکہ میں درویشوں کے بھیس میں تھا اس لیے کسی نے روک ٹوک نہیں کی، مگر ہرات کے شہزادے کو شک ہوا کہ میں نے حلیہ تبدیل کیا ہوا ہے، اس شک نے میرے کان کھڑے کر دیے۔ اس لیے میں نے سب سے کہا کہ مسلمان کے ساتھ مذاق کرنا کفر ہے۔ میں استنبول سے آیا ہوں اور پھر میں نے سب کے سامنے سفری کاغذات رکھ دیے تب کہیں جا کر انھیں یقین ہوا۔[۳۰] اس جیسی کئی مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں۔ جب انھوں نے اپنا یہ سفر مکمل کیا تو برطانیہ کے کئی سرکاری مندوبین نے ان سے ملاقات کی اور روس کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے بارے میں ان کے مشاہدات کو نہ صرف سنجیدگی سے سنا گیا بلکہ انھی مستشرقین کی آرا پر مبنی برطانوی پالیسی تشکیل دی گئی، کہ روس سے راست محاذ آرائی سے اجتناب برتا جائے جس کے کئی دور رس نتائج نے برطانوی قوت کو کمزور ہونے نہیں دیا۔ اگر اس موقعے پر برطانیہ روس سے محاذ آرا ہو جاتا تو سلطنت عثمانیہ کئی محاذوں پر خود کو بہتر انداز میں ترتیب دے

لیتی۔[۳۱]

ویمبری نے برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں ترکی اور وسط ایشیا کی علمی، ادبی اور سیاسی صورتحال پر لیکچر بھی دیے ہیں۔لندن میں ترکوں کے تمدن و ترقی پر ایک لیکچر بھی دیا جس کا اردو ترجمہ رسالہ حســـــن (اگست)، جلد دوم، نمبر ۸ میں شائع ہوا ہے۔رسالے میں ترجمہ نگار کا نام موجود نہیں۔ رسالے میں اس کا عنوان ''لیکچر ترکی کی عام ترقی اور شائستگی'' لکھا گیا ہے۔

اس لیکچر میں جو لندن میں منعقد کیا گیا ایک ایسا مجمع تھا جس میں کثیر تعداد میں انتظامی و عسکری عمائدین، پارلیمانی ارکان اور بہت سے ممالک کے سفرا بھی موجود تھے۔[۳۲] اس لیکچر میں انھوں نے ترکوں کی ترقی کا احوال بیان کیا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ تمدن و طرز معاشرت پر بھی اجمالی تجزیہ موجود ہے۔ترکوں کی عام تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> سلطنت ترکی کے تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے مجھ کو سب سے پہلے یہ ریمارک کرنا ہے کہ وہاں اب تک قدیم اسلامی طریقۂ خواندگی جاری تھا جو غالب درجہ مذہبی لباس میں ملبوس تھا۔[۳۳]



اس لیکچر میں انھوں نے یورپ کے سیاسی رویے کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ناپسند کیا جو ترکوں کے ساتھ اہل یورپ نے روا رکھا تھا ۔ اس رویے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس امر کے بیان کی بہت کم ضرورت ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ جدید لٹریچر کی اشاعت سے مسلمانوں کو عیسائیوں کے ساتھ نفرت کم ہو گئی ہے اور آئندہ بھی کم ہو جائے گی۔ اس تعصب اور اختلاف کی وجہ قرآن میں نہیں ہے جیسا کہ بالعموم سمجھا جاتا ہے بلکہ ہم لوگوں کا سیاسی برتاؤ ہے جو ہمیشہ جائز طور سے نہیں ہوتا۔[۳۴]

پروفیسر ویمبری کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مسلمانوں میں مغربی علوم کے حصول کی کوششیں نہایت تیز ہو گئی ہیں اس لیے مسلمان جلد یا بہ دیر ویسا ہی طرزِ زندگی اپنا لیں گے جیسا کہ مغرب چاہتا ہے۔ انھوں نے نو آبادیات کو جبر و تشدد کے راستے کو ترک کرنے کے لیے کہا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ مغربی یلغار مسلمانوں میں مغربی اقوام سے دوری پیدا کرتی ہے اور مسلمان مغرب کے اس رویے سے بددل ہو کر پھر اپنے اسلاف کے راستے کو اپنانا چاہتے ہیں۔

ویمبری کے خیالات اپنی جگہ مگر تاریخ کا مطالعہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ترکوں کے سلسلے میں یورپ کی ریاستوں کا سیاسی کردار اچھا نہیں تھا۔ انھوں نے ترکوں کے مذہبی رجحانات پر بھی بے جا تنقید کی ہے اور نو آبادیات کے دور میں عیسائی مبلغین کا کردار پیغمبر اسلام کی ذات کے حوالے سے ناشائستہ ہی نہیں گمراہ کن بھی رہا ہے۔ خاص کر ایسی کتابیں لکھی گئیں جو اہل مغرب کو مسلمانوں سے نفرت پر اکساتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اہلِ مغرب کے سیاسی کردار میں سختی در آئی۔

آج بھی ان مستشرقین کی علمی سرگرمیاں کئی حوالوں سے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان کی محنت اور لگن جہاں ان کے تحقیقی سرمائے کو وسعت دیتی ہے وہیں وہ اہل مشرق کے کئی اقداری رویوں پر ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جن سے یورپ والوں کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ اب یہ ہمارے دانشوروں کا کام ہے کہ وہ ان مستشرقین کے کاموں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ایسے تمام سوالات پر محاکمہ و استدراک کریں جن میں مشرق کے دینی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی سرمائے پر ناروا حملے کیے گئے ہیں۔



## حواشی و حوالہ جات

* لیکچرار، گورنمنٹ ڈگری سائنس اینڈ کامرس کالج، اورنگی ٹاؤن، کراچی۔

۱۔ ظفر عمر، ''مستقبل اسلام'' مشمولہ پنجاب ریویو لاہور، جلد اول، شمارہ نمبر۴،۵ (نومبر، دسمبر ۱۹۱۰ء)، ص۲۵۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ آرمینیس ویمبری، *Western Culture in Eastern Lands*، مترجم ظفر عمر (لاہور: عبدالرشید اینڈ برادرز، ۱۹۱۰ء)، ص۲۸۔

ظفر عمر نے باقاعدہ اس کتاب کے ترجمے کی اجازت ویمبری سے لی تھی، ان کے مابین جو خط کتابت اس کتاب کے ترجمے کے سلسلے میں ہوئی، اسے پنجاب ریویو لاہور، جلد اول، شمارہ نمبر۴،۵ (نومبر، دسمبر ۱۹۱۰ء) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ویمبری نے اس کتاب کے ترجمے کے حوالے سے مترجم کو لکھا کہ 'جو خیالات آپ نے میری کتاب اور خصوصاً اس حصے کی بابت ظاہر فرمائے ہیں جو اسلام کے مستقبل سے متعلق ہیں اسے دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسلامی دنیا کے مختلف ممالک کے روشن خیال اصحاب نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ترکی اور ایران کے تازہ ترین واقعات نے میرے خیالات کو بالکل حق بجانب قرار دیا ہے اور اگر دنیا جان بوجھ کر اندھی ہونا نہیں چاہتی تو وہ دیکھ لے گی کہ اسلام باوجودے کہ اس کے جسم پر اس کے سابق فرماں رواؤں نے کاری ضرب لگائی ہے، مرنے والا

نہیں ہے۔

۵۔ ایضاً۔

۶۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، حصہ دوم (اعظم گڑھ، ۱۹۵۱ء)، ص ا۔

۷۔ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، حصہ سوم (اعظم گڑھ، ۱۹۳۲ء)، ص ۲۷۔

۸۔ ایضاً، ص ۸۰۔

۹۔ آرمینیس ویمبری، *Western Culture in Eastern Lands*، ص ۳۳۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔

۱۴۔ آرمینیس ویمبری، ''مقدمہ''، تاریخ بخارا، مترجم نفیس الدین احمد (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء)، ص ا۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۔

۱۶۔ آرمینیس ویمبری، تاریخ بخارا، مترجم نفیس الدین احمد (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء)، ص ۸۔

۱۷۔ آرمینیس ویمبری، ''مقدمہ''، ص ۴۔

۱۸۔ آرمینیس ویمبری، تاریخ بخارا، ص ۳۰۲۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۰۳۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۷۴۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۹۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۹۶۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۱۸۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۱۹۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۲۰۔

۲۷۔ آرمینیس ویمبری، سیدی علی رئیس کا سفر نامہ، مترجم مولوی انشاء اللہ خاں (لاہور: حمیدیہ اسٹیم پریس، ۱۹۰۶ء)، ص ۸۔

اس سفرنامے میں ترکی کا یہ امیر البحر جن ممالک میں گیا ان مقامات کی تفصیلات فراہم کرتا گیا ہے، چونکہ وہ پرتگالیوں سے مقابلے کے لیے اپنے بحری بیڑے کے ساتھ نکلا تھا مگر بحری بیڑے کی تباہی کی وجہ سے اسے ہندوستان میں گجرات کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا پڑا اور یوں وہ ہمایوں کے دربار میں پہنچا۔ اس سفرنامے کو بھی ویمبری نے ترکی سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۲۹۔ ایضاً،ص۴۴؛ میر علی شیر نوائی وسط ایشیا کا ایک نامور ترکی شاعر گذرا ہے۔ یہ ۱۴۴۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۰۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا تخلص نوائی تھا۔ اس کی شاعری آج بھی بہت شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

۳۰۔ آرمینیس ویمبری، پروفیسر ویمبری کا سفر نامہ ،مترجم منشی محبوب عالم (لاہور: کارخانہ پیسہ اخبار،۱۹۰۳ء)، ص۲۴۰۔

ویمبری کے بارے میں سہ ماہی الزبیر (۱۹۶۲ء) میں سرعبدالقادر کا ایک مختصر سا مضمون ''دو گھنٹے ویمبری کے ساتھ'' چھپا ہے۔ ویمبری کی شخصیت کو جاننے کے لیے نواب سلطان جہاں کے سفر نامے سیاحت سلطانی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں منشی محبوب عالم کے ترجمے کے بارے میں ویمبری نے جو کہا انھی کے الفاظ میں پڑھیے:

> یہ کتاب تمھارے لاہور کی چھپی ہوئی ہے میری اس کتاب کا اردو میں خلاصہ چھپا ہے۔ اسے منشی محبوب عالم صاحب نے جو پیسہ اخبار کے ایڈیٹر ہیں انھوں نے شائع کیا ہے اور پروفیسر ویمبری کا سفر نامہ اس کا نام رکھا ہے۔ کیا تم انھیں جانتے ہو۔ میں نے کہا جانا کیا معنی وہ میرے بڑے دوست ہیں اور لاہور میں ہمارا وقت فرصت بیشتر اکٹھے صرف ہوتا تھا اس سے بہت خوش ہوئے، کہنے لگے انھیں بتا دینا کہ میں ان کے ترجمے کو کس قدر عزیز رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں یہ پیغام پہنچا دوں گا۔ یقیناً وہ اس سے بہت خوش ہوں گے۔

۳۱۔ ایضاً،ص۲۷۹۔

۳۲۔ آرمینیس ویمبری،''لیکچر ترکی کی عام ترقی اور شائستگی''،مشمولہ رسالہ حسن حیدرآباد دکن، جلد دوم، نمبر۸ (اگست،س ن)،ص۱۔

۳۳۔ ایضاً،ص۴۔

۳۴۔ ایضاً،ص۱۲۔

## مآخذ


عمر،ظفر۔''مستقبل اسلام''۔مشمولہ پنجاب ریویو لاہور، جلد اول، شمارہ نمبر۴،۵ (نومبر، دسمبر ۱۹۱۰ء)۔

نعمانی،شبلی۔مقالات شبلی۔حصہ دوم۔اعظم گڑھ،۱۹۵۱ء۔

______۔مقالات شبلی۔حصہ سوم۔اعظم گڑھ،۱۹۳۲ء۔

ویمبری،آرمینیس۔''مقدمہ''۔ تاریخ بخارا۔مترجم نفیس الدین احمد۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء۔

__________۔ تاریخ بخارا۔مترجم نفیس الدین احمد۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۹ء۔

__________۔ سیدی علی رئیس کا سفر نامہ۔مترجم مولوی انشاء اللہ خاں ۔لاہور: حمیدیہ اسٹیم پریس، ۱۹۰۶ء۔

__________۔ پروفیسر ویمبری کا سفر نامہ۔مترجم منشی محبوب عالم ۔لاہور: کارخانہ پیسہ اخبار،۱۹۰۳ء۔

__________۔''لیکچر ترکی کی عام ترقی اور شائستگی''۔مشمولہ رسالہ حسن حیدرآباد دکن، جلد دوم، نمبر۸ (اگست، س ن)۔

__________۔ Western Culture in Eastern Lands ۔ مترجم ظفر عمر۔لاہور: عبدالرشید اینڈ برادرز،۱۹۱۰ء۔